

اور پھر کچھ مدت بعد وہ باتیں توکرتے تھے لیکن یہ نقاہت بھی تھی اور قربت مرگ کی مردی بھی تھی کہ اُن کی آواز لبوں سے باہر آتے آتے دم توڑ دیتی تھی.. ظاہر نہیں ہوتی تھی..

اُن کے لب ہلتے جاتے تھے.. لیکن تہہ خانے میں بھر پور سکوت ٹھہر چکا تھا.. وہ اپنے تیس بول رہے تھے لیکن اُن کی آواز نہیں نکل رہی تھی..

اس زیر زمین آماجگاہ میں قلعے کا سشور ہوا کرتا تھا.. وہ توکب کا خالی کیا جا چکا تھا.. جو بھی اسلحہ یا خوراک یہاں سور کی گئی تھی وہ قندوز اور مزار شریف میں کام آچکی تھی.. اب یہاں کچھ خالی کارش .. بولتیں۔ پرانی شلوار قمیضیں کہ شالیوں کو رو سیوں نے نئی نکور وردیاں پہننا دی تھیں اور نیلے رنگ کے کچھ خالی ڈرم پڑے تھے..

وہ ہمیشہ سے تو اس قبر میں نہیں تھے..

یہ محض ایک اتفاق تھا.. اسے نصیب بھی کہا جاسکتا ہے جس نے انہیں اس تہہ خانے میں دھکیل دیا اور وہ ایک دوسرے کے وجود سے آگاہ ہوئے..

مزار شریف میں ہتھیار ڈالنے کے بعد وہ انہیں ہاتکتے ہوئے قلعہ جنگی میں لے آئے تھے.. اور پھر اُن کی مشکلیں کسی جانے لگیں.. پشت پیچے ہاتھ باندھے جانے لگے تو وہ نرس ہو گئے.. وہاں دو غیر ملکی میلی ویژن ٹیمیں بھی موجود تھیں جن کے کیمرے اُن پر تھے.. وہ ہر اساح ہو گئے کہ اب انہیں اجتماعی طور پر قتل کیا جانے لگا ہے کہ روایت یہی تھی اور جن کے ہاتھ ابھی بندھے ہوئے نہیں تھے انہوں نے بغاوت کر دی.. شالیوں کو اس کی توقع نہیں تھی وہ تو انہیں فتنہ پروری سے روکنے کے لیے باندھ رہے تھے.. اُن کے قتل کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا تھا لیکن وہ حواس کھو بیٹھے اور جن کی تلاشی مکمل نہیں ہوئی تھی وہ اپنے ہتھیار نکال کر فائز کرنے لگے.. دوستم کا پولیس چیف اُن کا نشانہ بن گیا... ایک

امریکی سی آئی اے کے ایجنت کے پر خپے اڑ گئے اور پھر ان پر بی۔52 کا عتاب نازل ہو گیا.. قلعے کی دیواروں میں نصب مشین گنوں نے جو کچھ ان کے بس میں تھا سب کا سب اُگل دیا.. ڈیزی کٹر اور بکر بستر آسمان سے نازل ہونے لگے اور کچھ صحن میں مٹی کے آتش فشاں اُبل کر انہیں زندہ دفن کرتے گئے.. یہ قیامت تو نہیں تھی پر قیامت سے کم نہ تھی.. بلکہ زیادہ تھی.. وہ رزق خاک تھے سو خاک ہوئے.. یہ کھیل تماشہ صرف چند لمحوں کا تھا اور پھر ختم ہو گیا..

قلعہ جنگی کے صحن کے اوپر ایک غبار معلق تھا.. اس غبار تلے سینکڑوں لاشے تھے.. جان بے شک شہادت سے نکلے مشکل سے نکلتی ہے.. موت یہ نہیں پڑھتی کہ یہ جنت کا آرزو مند ہے یا کافر ہے یا منکر ہے وہ اپنی اذیت کم نہیں کرتی.. جان بیلنے میں آئے ہوئے گئے کی ماں نہ ہی خپڑتی ہے.. جن کے بدن نسبتاً سلامت رہے تھے وہ پورے کے پورے پھر ک رہے تھے اور جو اتنے خوش قسمت نہیں تھے ان کے اعضاء ٹھنڈے نہیں ہوتے تھے اور وقوف و قفوں سے تھرھراتے تھے..

اب بھگدڑ میں انہیں کوئی جائے پناہ نظر نہ آتی تھی اور پھر اس تھے خانے کی پہلی دو سیڑھیاں نظر آئیں.. وہ اس میں باری باری گرتے گئے.. اور انہیں بھی گمان ہوا کہ وہ مر چکے ہیں اور موت کی تاریکی میں گر رہے ہیں..

رات کا کوئی پھر تھا جب چاندنی دوسری سیڑھی پر اتری تو ہر ایک آگاہ ہوا کہ وہاں اُس کے سوا کوئی اور بھی ہے..

یہ نہیں کہ وہ نج کر آگئے تھے.. اپنے بدنوں میں بر اجانان گولیوں اور بموں کے آہنی ٹکڑوں کو بھی ساتھ لائے تھے.. اور کئی روز کی بھوک اور پیاس تھی..

جانی اور اللہ بخش کے ہاتھ ابھی تک بندھے ہوئے تھے..

ان میں مرتفی بیگ کچھ بہتر حالت میں تھا اور اُسی نے تھے خانے کی تاریکی کو ٹھوٹ ٹھوٹ کر اندازہ لگایا کہ وہاں اور بھی ہیں.. اور کون ہیں!

تو وہ باتیں کرتے رہے ..

اُن کے لب ہلتے جاتے تھے .. وہ اپنے تیئں بولتے جاتے تھے لیکن تمہارے خانے میں سنا تھا ..

اُن کے اوپر جو چھت تھی اُس پر قلعہ جنگی کا کچھ صحنِ مکر چاندنی میں پھیلا ہوا ایک گرد آمیز کائنات کی مانند جس کا کوئی انتہا تھا جس کے سارے سیارے اور ستارے سکوت میں جا چکے تھے .. ٹوٹ پھوٹ کر بکھر چکے تھے، مردہ ہو چکے تھے .. نہ گھومتے تھے نہ گردش کرتے تھے بس مٹی میں اٹے منہ کھولے پڑے تھے اور صرف وہ سات تھے جو اس کائنات کے ایک بلیک ہوں میں پوشیدہ تھے ..

بلیک ہوں میں پناہ لینے والے یہ جانتے ہیں کہ اُن کے سانس عارضی ہیں اور وہ کسی بھی لمحے اُس کی سیاہ ہولناکی کے اندر نگلے جائیں گے اور فنا ہو جائیں گے .. اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر وہ اگلی سویرہ ہاتھ بلند کر کے تھہ خانے سے باہر آ جائیں اور سروں سے پگڑیاں اتار کر .. بے شک وہ صرف ابوطالب کی ایک پگڑی ہو .. اُسے گلے میں ڈال کر باہر آ جائیں تو کچھ امکان اگرچہ موجود اس بات کا تھا کہ وہ بخشش جائیں .. جان کی امان پا جائیں ..

اُن کے مقامی ساتھیوں نے ایسا ہی کیا تھا ..

لیکن اُن کا .. جو پگڑیاں گلے میں ڈال کر ہار مان گئے تھے اور اُن کا جو غیر ملکیوں کی آسمانی مدد کے سہارے جیت گئے تھے .. وطن ایک ہی تھا .. قبلے جدا تھے لیکن صدیوں کی آویزش کے باوجود ذمین ایک ہی تھی .. انہیں بہر طور اکٹھے رہنا تھا .. ہار جیت کا یہ کھیل آخری تونہ تھا اس لیے کھیل میں جیتا ہوا کھلاڑی یہ ذہن میں رکھتا تھا کہ آئندہ کبھی وہ بھی گلے میں پگڑی ڈال کر اُن کے سامنے ہاتھ بلند کر سکتا ہے اس لیے وہ ایک دوسرا کا لحاظ کرتے تھے ..

البتہ اُن کے لیے .. جو اس تھہ خانے میں مدفون تھے .. جو اپنا اپنا ایک

وطن رکھتے ہوئے بھی بے وطن ہوئے تھے ان کے لیے کوئی لحاظ نہ تھا.. کوئی پناہ نہ تھی ..

اگر آج شامی غیر ملکیوں کی آسمانی مدد سے جیت کی حالت میں تھے تو طالبان نے بھی تو غیر ملکیوں کی زمینی مدد سے ان کو زیر کیا تھا..

مدد.. آسمانی ہو یا زمینی بہر طور غیر ملکی ہوتی ہے.. اگر آج وہ جو پسا ہو رہے تھے اور آسمانی مدد کو کوستے اُس کی جان کے دیری ہوتے تھے تو جو کل تھا اور اُس کل میں ان کے مخالفوں کی حمایت میں آنے والے جو غیر ملکی تھے شامی ان کی جان کے دیری ہوتے تھے تو اس دیری کا ایک قابل فہم جواز موجود تھا.. وطن رکھتے ہوئے بھی بے وطن ہو جانے پر نصیب میں یہی کچھ لکھا جاتا ہے جو ایک بے وطن کے نصیب میں لکھا گیا..

انہوں نے ایک بے وطن کو دیکھا تھا جب وہ ناج رہا تھا..

اُس کا بدن مزار شریف کی ایک گلی میں والہانہ ناج رہا تھا..

اور قونیہ کے مست الاست درویش.. شاہ حسین کے ملگ یا شہباز قلندر کے قلندر بھی کیا تاپتے ہوں گے.. جو وہ ناج رہا تھا..

اُس نے کہیں سے بھی.. کسی درگاہ یا رقص کی اکیڈمی سے ناج کی تربیت حاصل نہیں کی تھی.. اس لیے وہ کوئی ایک خاص کلاسیکی یا پاپ رقص نہیں کر رہا تھا.. کٹھک یا راک اینڈ رول یا خٹک بھی ناج نہیں رہا تھا.. یہ رقص اُس کی پہلی اور آخری اختراع تھی.. اُس کے بدن کی پھرڑک یا ترپ کو کسی بھی رقص کی کلیگری میں فٹ کرنا ذرا مشکل تھا..

رقص میں ایسی حیران کن انفرادیت کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی..

وہا بھی تازہ تازہ مردہ ہوا تھا..

ایک بے وطن طالبان ابھی ابھی مزار شریف کی ایک گلی میں تازہ تازہ کیفر

کردار کو پہنچا تھا..

وہ کسی.. شریعت یا شہادت.. یا جہادی ملکے فلسفے سے متاثر ہو کر صدق دل سے.. اگرچہ کچھ عمر کی ناپختہ فہم کے صدق دل سے.. ادھر آنکلا تھا.. اُسے کچھ پتہ نہ تھا کہ اُس کے مقابل جو کافر ہوں گے وہ شائد اُس سے کہیں بڑھ کر پرہیز گار.. شریعت کے پابند اور باریش ہوں گے اور وہ بھی شہادت کے طالب ہوں گے اور وہ کسی مولانا سینڈوچ کا بہکایا ہوا صدق دل کی بے دھیانی میں ادھر آنکلا تھا اور اُسے یہ بھی گمان نہ تھا کہ راہ حق میں شہید ہونے کے بعد بھی وہ ایک منفرد رقص ہو جائے گا..

رقص و سرود اور موسیقی سے تنفس ہونے کے باوجود موت کے بعد رقص ہو جائے گا.. اُس کے تازہ تازہ مردہ بدن میں سرخیں داخل کر کے انہوں نے اُس کا ابھی تک گرم خون جتنا بھی ممکن ہو سکتا تھا نکال لیا.. اور پھر انہی سرخیوں کو خالی کر کے اُن میں پڑوں بھر کر اُس کی شریانوں اور نظام بدن میں یہ پڑوں انجیکٹ کرنے کے بعد اُسے ایک دیا اسلامی کا بھڑکتا ہوا شعلہ دکھادیا گیا..

ایک انسانی بدن میں اگر خون کی بجائے پڑوں بھرا ہو.. بے شک گردش میں نہ ہو تو اُسے آگ دکھادی جائے تو پھر وہ بدن کیسے اچھلتا ٹاپتا ٹپتا رقص کرتا ہے..

یہ انہوں نے مزار شریف کی ایک گلی میں دیکھا تھا.. لوگ تالیاں بجاتے تھے لیکن پڑوں میں جھلتے بھڑکتے بدن کے رقص کے ساتھ تال میں تال نہیں ملایا تھے کہ یہ کوئی باقاعدہ.. نسر تال میں گندھاناج تونہ تھا..

غیر ملکی زمینی مدد کی کوئی نسر تال نہیں ہوتی..

بے طعن رقص یو نہی بے سرے بھڑکتے اور ناچتے ہیں.. مردہ ہو جانے کے باوجود بھی.. چنانچہ اُن کے لیے.. جو اس تھے خانے کی عارضی عافیت میں پہنچا

تھے یہی بہت تھا کہ وہ مزار شریف کی کسی گلی میں رقص کنائ نہیں ہیں ..
 ان کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے .. وہ باقیں کر رہے تھے لیکن کوئی
 آواز نہ تھی .. تہہ خانے میں سیاہی کا ستانا تھا ..

مکر چاندنی قلعہ جنگلی کے صحن میں مدھم ہوتی تھی ..
 اور اُس کے نیچے ان کے ہونٹ ہل رہے تھے .. وہ نیم مردہ حالت میں
 پڑے باقیں کیے جا رہے تھے اور کسی نے بھی یہ محسوس نہ کیا کہ جانی خاموش ہو چکا
 ہے ..

صرف گھوڑا تھا جو منتظر تھا ..

اور وہ جانتا تھا کہ جو اُس کی پشت کو پیار سے سہلانا جاتا ہے بس وہی اُسے
 اس اذیت سے نجات دلا سکتا ہے .. جوزخی ہونے میں اور اندر ہیرے میں ہونے
 سے تھی .. سنائے اور اندر ہیرے میں جب کہ تہہ خانے میں اُترنے والی پہلی سیر ہی
 سے بھی مکر چاندنی سمنئے والی تھی .. ایک شعلہ بھڑکا اور ایک بھاری وجود کے
 گرنے کی آواز نے سنائے کوپاش پاش کر دیا ..

”مجھے اب بھی گھوڑوں سے پیار ہے ..“ جانی نے لبلی سے پیوست انگلی
 بمثکل الگ کی ..

گھوڑا .. رہوڈز کے مجسمے کی مانند یکدم گرا .. اُس کی تقدیس مرگ کا شکار
 ہوئی اور وہ خوراک ہو گیا ..

سینتیسوں سیڑھی کے آس پاس جہاں پچھلی شب مکر چاندنی تھی اب
وہاں تیز دھوپ تھی ..

دھوپ وہیں ٹھہری ہوئی تھی لیکن اُس کی کچھ سفیدی سیڑھیاں اُترتی تھے
خانے کے اندر سرات کرتی اُس کے انڈھیارے میں اپنا آپ گھولتی .. اُس میں
نقب لگاتی اُن سب کی کچھ نہ کچھ شناخت کرتی تھی ..

وہ سب ادھ موئے پڑے تھے اور گھوڑا اپر امویا پڑا تھا ..

وہ ساتوں بیہیں پیدا ہوئے تھے .. ہزاروں برسوں سے اسی تھہ خانے میں
تھے ..

لیکن ہزاروں برس پہلے کوئی ایک ساعت ایسی بھی گزری تھی جب وہ
ایک دوسرے کے لیے یکرا جبی تھے .. اُن کے چند ہتھیار سیاہ پگڑیاں اور جنون
بظاہر ایک جیسے تھے لیکن وہ ایک دوسرے سے رنگ و نسل، ثقافت اور خصلت میں
مختلف تھے .. وقت کی وہ ساعت جب وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے قندوز
کے محاصرے کے دوران اُن پر محیط ہوئی تھی .. وہ امریکیوں سے لڑنے آئے تھے
لیکن وہاں اُن کے مدقائق اُنہی کے عقیدے کے باریش لوگ تھے .. امریکی اوپر
ہی اوپر کہیں آسمانوں میں تھے اور اپنے بوجھ گرا کر چلے جاتے تھے .. یہ بوجھ پندرہ
ہزار پاؤ نڈو زندگی ڈیزی کثر ہوتے تھے جو عرف عام میں منی ایتم بھی کھلاتے تھے اور

اس بوجھ کی بھڑک اور پھٹے سے پورے پورے پہاڑی سلسلے میدانوں میں بدل جاتے تھے اور ان کے دامن میں آباد گاؤں اور بستیاں لمحوں میں دفن ہو جاتے تھے۔ کلستر بم اور بنکر بسٹر بھی وہ بوجھ تھے جو ان پر گرتے تھے۔

اُن میں سے کئی جو سرحد پار سے آئے تھے اور صرف تلواروں سے مسلح تھے اور انہیں اس جذبے سے سرشار کیا گیا تھا کہ اگر ایمان مضبوط ہو تو کفر کو تلوار سے بھی زیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن کفر تھا کہ آسمانوں پر ہی اڑان کر کے چلا جاتا تھا، نیچے آتا تو وہ اُس پر وار کر کے اپنے ایمان کی پختگی کا مظاہرہ کرتے۔ مون تو بے قیق بھی لڑ سکتا تھا اُن کے پاس تو پھر کچھ زنگ آلود تلواریں تھیں۔ امریکی جنگی طیارے دھوپ کی راہ میں حائل ہو کر مسلسل اُن پر سایہ کرتے تھے۔

اُن کی خندقوں میں اور ارڈر گرڈ لاشوں کے انبار تھے جن میں وہ بکشکل بیٹھتے تھے کہ ہر لمحے کوئی رفیق بے نور آنکھوں سے انہیں گھورتا تھا کہ میری تعظیم کرو اپنے بوٹ میرے چہرے پر نہ رکھو۔ اگر وہ پاکستانی ہوتا تو اُس کے چیتا جو گرز سے اُس کی شناخت کر لیتے چاہے اُس کی صرف ایک ایک ٹانگ ہی کہیں دبی پڑی ہوتی...

مرتضی بیگ بھی چوری چھپے ادھر آیا تھا..
 ایک شدید رُد عمل نے اُسے سرحد کے اس پارڈ ہکلیں دیا تھا..
 دوسروں کی نسبت اُس کی وجوہات کچھ مختلف تھیں.. ذاتی تھیں..
 اُس کے والد ارتضی بیگ بھی چوری چھپے ادھر آتے رہتے تھے.. جب
 ادھر روس کا راج تھا.. وہ سی آئے کی اُس ٹیم سے مسلک تھے جو کراچی پورٹ
 پر لنگر انداز جہازوں سے اُترنے والے اسلحے کی مگر انی کرتی تھی... کلاشنکوفوں،
 راکٹ لانچروں، لینڈ ما نز وغیرہ کو کنٹریز میں لا د کر... پاراچنار کے راستے لنگر ہار
 اور پنجشیر تک پہنچاتی تھی.. جہاں مجاہدین کے مختلف گروپ جن میں احمد شاہ
 مسعود سرفہrst تھا اسے وصول کر کے ”بدی کی سلطنت“ سوئیٹ یونین کے
 خلاف جہاد میں حصہ لینے والوں تک پہنچادیتے تھے... اس سارے نیٹ ورک میں
 فوج مکمل طور پر متحرک تھی اگرچہ سرکاری طور پر بار بار متشرع صدر صاحب اعلان
 کرتے تھے کہ ہم افغان جہاد کو صرف اخلاقی سطح پر سپورٹ کر رہے ہیں.. فوج کی
 انٹیلی جنس کا مکمل رُخ افغانستان کی جانب تھا.. اور یہیں سے اس سلوگن نے جنم
 لیا کہ افغانی دراصل پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں اس لیے اُن کی مدد کرنا ہمارا قومی
 اور ظاہر ہے مذہبی فریضہ ہے.. آئی ایس آئی کے افسر پاکستان سے زیادہ افغانستان
 کے مختلف حصوں میں پائے جاتے تھے.. کراچی میں اُترنے والے اسلحے کے لیے

بھی این ایل آئی کی فوجی گاڑیاں اور کنٹیز استعمال کئے جاتے ..

اسلحے سے بھرے ہوئے یہ کنٹیز کراچی سے ننگہ ہار تک انٹیلی جنپ کے کرنل ارتضی بیگ کی ذاتی نگرانی میں سفر کرتے تھے اور اس طویل سفر کے دوران بار بار رُکتے اور متعدد بار کھلتے تھے .. ان کے آہنی شر اُٹھتے اور ان میں سے جزل صاحبان کا حصہ نکال کر آرمی کی جیپوں پر لاد دیا جاتا ... یہ ایک نارمل پریکش تھی .. چنانچہ مجاہدین کے کمانڈرز تک پہنچتے پہنچتے یہ کنٹیز خاصے بلکہ ہوچکے ہوتے .. یہ تو ممکن نہ تھا کرنل صاحب جہاد کے شرات کے لیے قیامت تک انتظار کرتے اور اس بھتی گنگا میں ہاتھ نہ دھوتے .. وہ صرف ہاتھ دھونے پر ہی اکتفانہ کرتے بلکہ اس میں مکمل اشنان کر کے نروان کی حدود کو چھونے لگتے .. اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کرتے ہوئے گجرات اور جہلم کے درمیان کہیں یہ کنٹیز رُکتے اور اس بھتی گنگا میں سے بہت کچھ نکال کر اپنے منتظر رفقاء کے حوالے کر دیتے جو انہیں گدھوں پر لاد کر لے جاتے .. بعد میں صرف اسی اسلحہ کی فروخت سے وہ ایکشن کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل ہوتے .. کرنل ارتضی بیگ نے ملکی سیاست میں ایک نمایاں مقام پایا اور افغان جہاد کے ہیروز میں ان کا شمار کیا گیا .. اور ہاں یہ ٹریفک یک طرفہ نہ تھی ..

افغان سرحد سے واپسی پر یہ کنٹیز مکمل طور پر خالی نہ لوٹتے .. ان میں سفید سفوف کی کچھ پوٹلیاں ہو تیں جو ایک مرتبہ پھر جہلم اور گجرات کے درمیان ان کے رفقاء کے حوالے کر دی جاتیں .. صرف ایک فرق کے ساتھ کہ پہلے وصولی کے لیے متعدد گدھے موجود ہوتے لیکن اب بار برداری کے لیے صرف دو گدھے ہی کافی ہوتے ..

افغانستان میں ”ایول ایمپائر“ کے خاتمے کے لیے ایک مقدس جنگ میں حصہ لینے والے مجاہدین کے لیے اسلحہ صرف کنٹیز میں ہی نہیں ٹرینیوں میں

بھی آتا تھا.. رائفلین، مشین گنیں، راکٹ لانچر، مارٹر شیل سب کے سب چینی ساخت کے ہوتے تھے لیکن یہ چینی کی جانب سے اُس کے حریف سو ویٹ یونین سے برس پریکار مجاہدین کے لیے ایک تھغہ یا صرف خیر سگالی کے جذبات کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی ڈالروں میں ادا گی انگل سام اپنے پلے سے کرتا تھا.. چینی نہ صرف رو سیوں کی حزیمت کا باعث بھی بن رہے تھے بلکہ پکے کار و بار یوں کی مانند بے مثال منافع بھی کمار ہے تھے..

کراچی سے آئے والی یہ پیشہ ٹرینیں عام طور پر چکلالہ کے ٹیشن پر رکتیں اور وہاں سے یہ اسلحہ اور جڑی یکمپ اور سیکٹر F/7 کے "سیف ہاؤسز" میں منتقل کر دیا جاتا.. اسلام آباد کے آب پارہ چوک سے ذرا دھر زیر و پوائنٹ سے ذرا آگے آئی ایس آئی کا "The Main" تھا.. جہاں افغان جنگ کا ایک اور ہیرہ جزل اختر عبد الرحمن انجارج تھا.. شنید ہے کہ یہاں جس بھی فوجی افسر کی تعیناتی بطور کرمل ایڈ من ہوتی.. اکاؤنٹس اور کیش کا شعبہ جس کی نگرانی میں ہوتا اُس پر قدرت اتنی مہربان ہوتی کہ وہ چند دنوں میں قارون کا ہم پلہ ہو جاتا بلکہ اُس سے بھی کہیں آگے چلا جاتا.. قارون نے بہر طور وہ دولت لوٹی یا کمائی یا مشکل سے حاصل کی تھی لیکن کرمل ایڈ من اپنی نشت پر بیٹھے بیٹھے یہ سب کچھ حاصل کر لیتا..

امریکہ کی جانب سے مجاہدین کے آٹھ گروپوں کو آشیرواد حاصل تھی.. ان گروپوں کو جہاں اسلحہ کی لا محدود سپلائی دی جاتی وہاں ان کے لیڈروں کے ذاتی اخراجات کے لیے ہر ماہ آٹھ لاکھ روپے کی رقم ادا کی جاتی.. ان میں سیاف اور ربائی بھی شامل تھے اور حکمت یار بھی.. ان میں افغان جہاد میں حصہ لینے والا ایک ایسا لیڈر بھی تھا جس کا مستقل قیام اسلام آباد کے سب سے پاش ایریا میں تھا اور اُس مجاہد کی بیٹیاں ہمیشہ امریکی نیلی جیزر میں ملبوس ہوتیں اور ان کے

جہاد کا ایک اپنا، ہی کانپٹ تھا جو اسلام آباد کی کلبوں، ریستورانوں اور پرائیویٹ پارٹیوں میں اپنے رنگ اور انگ دکھاتا۔

یہ لیڈر عام طور پر آئی ایس آئی کے "The Main" میں ہر ماہ حاضری دیتے۔

"کا ایک وسیع تہہ خانہ تھا جسے سڑانگ روم کہا جاتا تھا۔" اس تہہ خانے میں ادا بیگ کی رقم صندوقوں یا آہنی تجویزوں میں نہیں رکھی جاتی تھی بلکہ اس کی وسعت میں فرش پر ڈھیروں کی صورت۔ اگرچہ ایک خاص ترتیب اور نفاست سے پڑی ہوتی تھی۔ لاکھوں اور کروڑوں کے حساب سے۔ بلکہ بے حساب کیونکہ اس کی گنتی کبھی نہیں ہوتی تھی۔ رقم ہمیشہ حسب خواہش کرنی میں میر ہوتی۔

سڑانگ روم کے تہہ خانے کا نصف حصہ ڈالروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ڈالروں کے بعد سعودی ریالوں کی اجارہ داری تھی۔

پاکستانی روپوں کی بھی افراط تھی اور افغانی بھی تھے جو صرف اس لیے حاصل کیے جاتے کہ ان سے افغانستان میں برسر پیکار مجاہدین کی حوصلہ افزائی کی جاسکے۔ وہ مجاہدین بھی وسعت علم میں طالبان سے کم نہ تھے اور ڈالر اور ریال پر یقین نہ رکھتے تھے۔ انہیں صرف افغانی نوٹوں کی پہچان تھی۔

یہ ایس ایس فنڈ تھا۔

اس کا کوئی آڈٹ نہ تھا۔

کوئی اندر راج نہ ہوتا تھا کہ یہ کتنا آیا اور کتنا گیا اسی لیے کریل ایڈ من دنوں میں قاروں ہو جاتا تھا اور آل انچارج جز ل صاحب تو پتہ نہیں کیا ہو جاتے تھے۔ اور ہو گئے۔

ان دنوں آٹھ لاکھ روپے مہانہ بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ آج کے ایک

کروڑ سے بھی کہیں زیادہ اور اسے کسی سوٹ کیس یا بیگ میں بند کر کے نہیں لے جایا جا سکتا تھا کہ ان دنوں ابھی پانچ سو اور ایک ہزار کے نوٹ رائج نہیں ہوئے تھے اس لیے نوٹوں کے یہ پلندے لیڈروں کی بڑی بڑی گاڑیوں کی ڈیکوں میں سٹیک کیے جاتے اور اکثر اوقات جب ڈکی میں مزید گنجائش نہ رہتی تو ڈاروں کے پلندے مجبوراً پچھلی نشتوں پر ڈھیر کر دیے جاتے ..

بعض اوقات ان پلندوں کو کسی لیڈر کی گاڑی کی ڈکی میں رکھنے والے کسی معمولی فوجی کی قسمت بھی بدلت جاتی .. اسے بھی افغان جہاد کے شہر میں سے کوئی ایک پھل ڈاروں کی ایک گٹھی کی صورت میں مل جاتا ..
اس تمامتر آرگانائزیشن کے باوجود افغان جہاد صراط مستقیم پر نہیں جا رہا تھا ..

اسے اُس سیدھے اور پوتھراتے سے ہٹانے والے رو سیوں کے ہیلی کا پڑھ گن شپ تھے جو افغانستان کے دیہات اور مجاہدین کو بر باد کرتے چلے جاتے تھے .. وہ بمبار طیارے تھے جو بے در لغہ ہرشے کوتاہ کرتے جاتے تھے ..
ان ہیلی کا پڑھ گن شپ اور طیاروں کی آسمانوں پر مسلسل موجود گی امریکیوں اور مجاہدین کے لیے اُس جگہ پر درد تھی جس کا نام نہیں لیا جا سکتا ..
انہیں آسمانوں سے ہٹانے کے لیے ایس-اے-سیوں میزائل استعمال ہوتے تھے جو مکمل طور پر موثر نہ تھے .. ان کی ہٹ ریشو تیس فیصد سے بھی کم تھی .. اور روسی اس نقصان کو فوری طور پر پورا کر کے آسمانوں پر اپنی برتری قائم رکھنے میں کامیاب رہتے تھے .. امریکہ نے بہت دیر صبر کیا لیکن جب ”ایول ایمپائر“ قوت ایمانی اور ڈاروں کے سامنے ڈالی رہی تو پھر مجبوراً ایک ایسے ہتھیار کو اسلحہ خانے سے نکالنا پڑا جسے امریکیوں نے صرف تیری جنگ عظیم کے لیے سنپھال رکھا تھا اور خفیہ رکھا تھا ..

یہ سٹنگر میزاں کل تھے ..

اُن زمانوں میں صرف ایک میزاں کی تیاری پر ایک لاکھ ڈالر کا خرچ
اُٹھتا تھا.. جب سٹنگر ز ایک مجبوری ہو گئے تو چکالہ ایئرپورٹ پر سی ون تھری
اُترنے لگے.. سعودی ایئر لائس کی فلائیٹس پر وہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اُترنے
لگے ..

ان میزاں کوں نے جنگ کا نقشہ بدل کر رکھ دیا ..

ایس-اے-سیون چہاں تمیں فیصد ہٹ کی الہیت رکھتے تھے وہاں سٹنگر
جب ایک بار فائر کر دی جاتی تھی تو وہ ہیلی کا پڑگن شپ یا کسی بمبار طیارے کو تباہ
کیے بغیر نہ رہتی تھی ..

سٹنگر کی ہٹ الہیت سو فیصد تھی ..

ہیلی کا پڑگن شپ اور رو سی طیارے مکھیوں کی طرح مارے جانے لگے
اور بالآخر رو سی ریچھ نے انہیں گراونڈ کر دیا ..

جب فضاؤں میں گن شپ اور طیارے نہ رہے تو افغانستان میں ایک
عظمیم فتح کامید ان صاف ہو گیا ..

مرتضی بیگ کے مجاہد باپ کے ہاتھوں میں بھی کچھ سٹنگر ز آئے جن میں
سے کچھ آگے گئے اور کچھ پیچھے اُس کے پاس رہ گئے ..

کسی ایک سٹنگر کو بینے سے دو تین فیکٹریاں خریدی جاسکتی تھیں ..

کرنل ارتفی بیگ ریٹائرمنٹ کے بعد نہ صرف ملکی سیاست میں معزز
تھہرے بلکہ انہوں نے اس عظیم جہاد کے ثمرات کو ایک انڈسٹریل ایمپائر میں بدل
دیا اور ایک آسانی زندگی کی لطف اندوzi میں شب و روز بسر کرنے لگے ..

مرتضی اُن کا کراؤن پرس تھا ..

اور ایک کراؤن پرس جس شان و شوکت کا حقدار ہوتا ہے .. وہ نہ صرف اُسے

بلکہ اُس کے قریبی دوستوں کو بھی وافر تعداد میں ملی.. یاد رہے کہ یہ وہ شان و شوکت نہیں جو کسی برتاؤ نوی یا یورپی کراون پرنز کے نصیب میں ہوتی ہے بلکہ وہ تو اس کے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے کہ وزارت خزانہ ہر وقت اُنہی کے حساب کتاب پر نظر رکھتی ہے اور اگر وہ اپنے وظیفے کی رقم سے ذرا تجاوز کریں تو ان کی جواب طلبی ہو جاتی ہے اور ملکی اخبار شور مچا دیتے ہیں .. ایک پاکستانی کراون پرنز جو ایک مجاہد کا بیٹا ہوتا ہے ان پابندیوں سے ماوراء ہوتا ہے اور اُس سے کوئی سوال نہیں پوچھے جاتے ..

مرتضی بیگ اپنے نامور والد کے افغانی جہاد کے کارنا موں کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کو پڑھتے پڑھتے جوان ہوا .. ان کتابوں کی اشاعت پر خاصی رقم صرف ہوتی تھی اور انہیں ملک کی اہم ہستیوں اور چیزیں کالم نگاروں کو تخفی کے طور پر بھیجا جاتا تھا ..

ارضی بیگ اپنے کراون پرنز کے سرپر وہی تاج رکھنا چاہتے تھے جس میں سنتگر زمکانشکو فوں، راکٹوں اور سفید سفوف کے کوہ نور جڑے ہوئے تھے اور وہ اس تاج کی جماعت اور سچائی میں اُسے اکثر اپنے سامنے بٹھا کر مدلل یکھر دیا کرتے تھے جس میں وہ ثابت کر دیتے تھے سو ویٹ یونین کے بکھرنے میں اُس کے پاش پاش ہو جانے میں اُن کی بے لوث قوت ایمانی اور مجاہدانہ کاوشوں کا بڑا ہاتھ تھا ..

یہ یکھروہ ہمیشہ تبدیتے تھے جب وہ گئی رات اپنے "سیف ہاؤس" سے لوٹتے تھے .. "سیف ہاؤس" شہر کی ایک تہذیب یافتہ اور گھنی آبادی کے درمیان میں پوشیدہ ایک ایسا گھر تھا جس کی ظاہری صورت سے یہ نہیں لگتا تھا کہ یہاں کوئی رہتا ہے ... دن کے وقت وہ بے آباد لگتا تھا ..

وہ گئی رات تب آباد ہوتا جب اُس کے وسیع پورچ میں مہنگی اور دھنڈلاتے

ہوئے شیشوں والی گاڑیوں کی قطار لگ جاتی ...

”سیف ہاؤس“ ایک دارالامان تھا.. کہ جو بھی اس میں داخل ہوتا وہ امان میں آ جاتا.. وہ امان سے بے فکر اور لا پرواہ ہو کر ارضی بیگ کی یونیک مہمان نوازی کے سایہ عاطفت میں آ کر زندگی کی کلقوتوں کو کڑوے پانیوں میں ڈبو دیتا.. خود بھی ڈوبتا.. ڈوبنے کے بعد ابھرتا تو.. اپنے سامنے دنیا کی حسین ترین ناف کو سکھتے لچکتے دیکھتا اور اگرچہ اُس کے اوپر راحت کی بھاری وادیاں بہار پر ہوتیں لیکن وہ اُس ناف تلے جو لطف کے ساز و سامان تھے انہیں دیکھتا.. اُس پر ڈالریا روپے جو کچھ بھی حسب استطاعت ہوتا تھا اور پھر کسی ایک ناف کو ترجیح دے کر اُس کے ہمراہ ”سیف ہاؤس“ کے متعدد بیڈرومز میں سے کسی ایک میں جائیتا..

سائیڈ ٹیبل پر رائل سلیوٹ کی بوتل اور گلاسوں کے زیر سایہ ویاگرا یا ریپل کی گولیاں منتظر ہوتیں .. کہ ان میں سے پیشتر ڈھلتی عمر کے لوگ تھے اور جو کچھ تھا وہ بھی ڈھل چکا تھا سے آمادہ عمل کرنے کے لیے کبھی یہ گولیاں کار آمد ہو جاتیں اور کبھی نہ بھی ہوتیں ..

ارضی بیگ اسی ”سیف ہاؤس“ سے واپسی پر کراون پنس کو اپنے سامنے بٹھا کر یک پر دیا کرتے تھے ..

کراون پنس بھی اکثر اسی حالت میں ہوتا جس حالت میں قبلہ والد صاحب ہوتے .. شہر کے تمام ریستوران، پرائیویٹ شکار گاہیں اور گھرانے اور فارم ہاؤس اس کی زد میں تھے کیونکہ ایک تو وہ ایک نامور مجاہد اور صنعت کار کا بیٹا تھا اور دوسرے وہ دوچار ہفتوں کے بعد ایک نئی پڑوں میں سے اترتا... اگرچہ لندن اور پیرس میں بھی کچھ معمولی سی رہائش گاہیں تھیں اور وہاں آتا جاتا رہتا لیکن زندگی کا جو بے حساب اور بے انصاف لطف یہاں تھا وہاں نہ تھا... ان غیر ملکی رہائش گاہوں میں کل وقتی ملازم رکھنا وہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے اور ناشتہ خود بنانا پڑتا تھا..

لیکن اس بے مہار بے فکر حیات میں کوئی ایک ساعت آئی..

اس ساعت کے یکدم آجائے کا کوئی جواز نہ تھا..

یہ ساعت شاید انسانی دماغ کے لاتعداد غیر متحرک خلیوں میں سے کسی ایک کے بے جواز متحرک ہو جانے سے وجود میں آ جاتی ہے..
اس کی کوئی توجیہہ بیان نہیں کی جاسکتی..

کوئی ایک ساعت ایسی آگئی جب مرتضی بیگ نے اپنے کراون کو بوجھل محسوس کیا۔ زندگی میں پہلی بار اس میں سے سٹنگرز، کاشنکوفوں اور سفید سفوف کی... اور ”سیف ہاؤس“ سے لوٹتے والد صاحب کے منہ سے شراب اور ان کے وجود میں رچی جنس کی کنی کی ناقابل برداشت بُو آنے لگی.. اور وہ باغی ہو گیا۔
ویسے بغاوت کبھی بے جواز نہیں ہوتی..
جیسے دہشت گردی بھی کبھی بے جواز نہیں ہوتی..
ہاں ایک عام ساما جرا ہوا..

وہ شہر کے سب سے ان کاریگر اور قدیمی ہیئت ڈریسر کے سیلوں میں آؤیزاں متعدد قد آدم شیشوں میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا اور دھیان رکھ رہا تھا کہ وہ کہیں اس کے سر کے اس حصے پر قینچی کے وارزیادہ نہ کر دے جہاں اس کے بال چھدرے ہو رہے تھے اور اس نے سرسری طور پر پوچھا ”گلو.. تم پچھلے دو ماہ سے کہاں تھے.. تمہارے کاریگروں کو بھی کچھ پتہ نہ تھا کہ تم کہاں چلے گئے ہو.. کہاں تھے؟“

”بس بیگ صاحب.. میں بس ادھر ہی تھا..“

”اوے یہاں آنے والی کسی خاتون کے ساتھ تو کہیں نہیں نکل گئے تھے؟“

”نہیں جی..“ گلوخان کے پسید چہرے پر شرماہث آگئی ”آپ جانتے ہیں

کہ مجھے یہ شوق نہیں..“

”تو پھر کہاں تھے؟“ مرتضیٰ کو بھی کریدنے میں مزا آنے لگا..

”آپ بتائیے گا نہیں کسی کو..“

”نہیں.. کہاں تھے..“

”میری زندگی نے ایک کروٹ لی ہے بیگ صاحب..“ وہ برا بر میں بال کاٹتے کار گیر کی جانب ایک نظر دیکھ کر سرگوشی میں بولا ”میں قبائلی علاقے میں گیا تھا جہاد کی ڈرینگ لیئے..“

”کیا؟“ مرتضیٰ بیگ اتنا ششدہ رہوا کہ گلوکی قیچی نے اس کی گردن کے پچھلے حصے میں ایک ہلاکاساز خم لگا دیا..

گلوخان ایک پڑھا لکھا.. مغربی موسیقی کا شدید شوقین.. صرف نفس لباس اور ہمیز ڈرینگ میں دلچسپی لینے والا نوجوان.. جسے مذہب سے عید بقر عید اور جمعہ کی نماز کے سوا کوئی لگاؤ نہ تھا..

”لیکن کیوں گلو؟“

”آخرت کی بھی تو کوئی فکر کرنی چاہیے مرتضیٰ صاحب.. یہ سب کار و بار اور بال بچے کسی کام نہیں آئیں گے.. عمل ہی کام آئیں گے.. جہاد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے..“

”لیکن گلو ہمارے ملک میں تو کوئی جہاد نہیں ہو رہا.. ہیں؟“

”دنیا کے دوسرے خطوں میں تو ہو رہا ہے ناں سر.. کشمیر میں.. چیچنیا میں.. افغانستان میں.. تو مومن کا فرض ہے کہ ان کے ساتھ شامل ہو کر طاغوتی قوتوں کو شکست دے اور اسلام کا بول بالا کرے..“

”اوپاکستان..“

”پاکستان کا تو اللہ تعالیٰ محافظ ہے.. یہاں بھی جہاد ہو گا انشاء اللہ.. آپ کسی سے ذکر نہ کیجئے گا لیکن آئینہ چند ہفتون میں.. اپنا کار و بار و اسنڈاپ کر کے میں

بھی جہاد کے لیے جا رہا ہوں .. جنت بٹ رہی ہے سر .. ”

گلوخان عجیب و غریب زبان بول رہا تھا... وہ ہمیشہ تازہ ترین انڈیں گانوں .. کرکٹ میچوں . فلمی سکینڈ لز اور فیشن شوز کے بارے میں اپنی قیچی سے بھی زیادہ تیزی سے کو منظری کرتا تھا.. یہ ایک نہ سمجھ میں آنے والی تبدیلی تھی .. اس رات بلیک لیبل کی پونی بوتل اور پرانے پنجابی گانوں کے روی مکس پر نخزے دکھانے والی اداکارہ کا وہ بدن جو ٹیلی ویرین پر بے حد ہیجان خیز لگتا تھا اگرچہ بے لباس خاصانا تو اس لگتا تھا.. راحت نہ دے سکا .. پہلی بار کراوائی پر نس کو اپنے کراوائی میں کامنوں کا احساس ہوا ..

اس نے موبائل پر گلوخان سے رابطہ کیا ..

”جی مرتفعی بھائی آپ جب کہیں میں بندوبست کر دوں گا .. بلکہ آپ کے ساتھ چلوں گا سر“

صرف ایک نہ سمجھ میں آنے والی صورت حال کو سمجھنے کے لیے .. ایک تجسس کی خاطر .. ایک نئے نئے کا تجربہ کرنے کے لیے .. اپنے والدین سے یہ کہہ کر کہ وہ چند دوستوں کے ہمراہ بوت کلب کراچی میں چند روز گزارنے جا رہا ہے وہ گلوخان کے ہمراہ علاقہ غیر میں ایک جہادی یکمپ میں جا پہنچا ..

سب نے اسے شک کی نظروں سے دیکھا کہ وہ صاف سترے رخساروں والا داڑھی کے بغیر تھا ..

گلوخان ان سب سے بغل گیر ہوتا تھا ..

وہاں عجیب سے لوگ تھے ..

ٹنگ نظر اور متعصب .. اگرچہ بے حد نذر اور بیباک تھے اور ہینڈ گر نیڈ کو تب تک نہ پھینکتے تھے جب تک کہ اس کے پھٹنے کا آخری لمحہ نہ آ جاتا .. ان میں سے بیشتر کم پڑھے لکھے اور دیہاتی تھے جو یکمپ کمانڈر کے وعظ

کے دوران سر جھکائے اپنی نوئیز داڑھیاں سہلاتے رہتے.. ان کی سوچ مکمل طور پر یک طرف تھی اور مخالف سمت سے آتی ہوئی کوئی بھی سوچ سوائے کفر کے اور کچھ نہ تھی..

ان کے ساتھ بحث نہیں کی جاسکتی تھی..

وہ سر سے پاؤں تک سرشار تھے..

سوچ کجھ سے ماورا ہو چکے تھے..

یہ مرتفعی بیگ کے شب و روز سے الگ کوئی اور ہی شب و روز تھے..

اگرچہ ان میں تنگ نظری اور تعصب تھا مگر یہ کوئی اور ہی زندگی تھی..

منجگانہ نماز۔ تسبیح۔ وعظ اور ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت..

خوراک بڑی تھی اور رہائش اس سے بدتر..

لیکن مرتفعی یہ سب کچھ سہہ گیا کہ یہ مختلف تھا.. ایک نیانا آشنا نہ

تھا.. اسے یہ اذیت جھینٹے میں لطف آنے لگا.. اب وہ دیوار کے اس پار جا کر اپنے

آپ کو آزمانا چاہتا تھا.. یہ محض ایک ایڈو پچر نہیں تھا بلکہ اس کی روح میں کہیں

ایک خلش تھی پچھلے جہاد کے ثمرات کے نتیجے میں اُبھرنے والے ارتقانی بیگ کی

انڈسٹریل ایمپائر اور سیف ہاؤس کی.. اور اسکے پیچھرے کی.. اس خلش نے جہادی

کیمپ کی سادہ اور پرمخت قت زندگی میں سے جنم لیا تھا.. یہ لوگ کم از کم اس کے باپ

سے زیادہ کھرے اور سچے تھے..

وہ کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا.. اگرچہ یہ کشمکش بھی اسے بے چین رکھتی تھی کہ

اگر مخالف بھی مسلمان ہے تو اس کے سامنے جنگ میں اتنا جہاد ہے؟.. اور اسے

یقین دلایا جاتا کہ طالبان اسلام کے بنیادی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ایک سچے

اسلامی معاشرے کے لیے کوشش ہیں اور ان کے جو بھی مخالفین ہیں انہیں نیست

ونابود کرنا عین جہاد ہے.. اور اگر وہ مزید بحث کرتا تو اسے شک کی نظر وہ سے